تفسیر ماجدی ــــ ایک جائزہ

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (۱۸۹۲ ــ ۱۹۷۷ء) کی ذات گوناگوں اوصاف وعناصر سے مرکب تھی۔ فلسفہ، شاعری، تصوف اور صحافت سے ان کی علمی زندگی کے مختلف ادوار کی شناخت ہوتی ہے۔ مثلاً وہ ادیب وانشاپرداز تھے اور اس حد تک کامل تھے کہ ایک صاحبِ طرز ادیب کہلائے۔ لیکن ان کی زندگی کا سب سے اہم باب قرآنی علوم کی خدمت کا ہے۔

قرآنیات میں مولانا کی چند کتابیں بہت اہم ہیں مثلاً:

۱۔ الحیوانات فی القرآن یا حیوانیات قرآنی۔ یعنی قرآن مجید میں جن جانوروں کا ذکر آیا ہے ان کے اسماء، افعال وصفات کا یہ ایک جامع قاموس ہے۔ ان کی ترتیب حروف تہجی کے حساب سے کی گئی ہے۔

۲۔ ارض قرآن یا جغرافیہ قرآنی۔ اس کتاب میں قرآن مجید کے تمام جغرافی اسماء، ملک، شہر، پہاڑ اور ان کے متعلقات کا جامع لغت تیار کیا گیا ہے۔

۳۔ اعلام القرآن یا قرآنی شخصیات۔ اس میں جن وانس اور فرشتے ہر قسم کی قرآنی شخصیات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ مولانا اعداد قرآنی، نباتات قرآنی اور جمادات قرآنی پر بھی کتابیں لکھنا چاہتے تھے مگر وقت اور حالات کی وجہ سے یہ مکمل نہ ہوسکیں۔ ان کے علاوہ قرآنیات میں مولانا کی دو اہم کتابیں سیرت نبوی قرآنی اور بشریت انبیاء بھی لائق ذکر ہیں۔ یہ تمام کتابیں دراصل تفسیر ماجدی کی تیاری اور ترتیب کا ثمرہ ہیں۔

قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کا خیال سب سے پہلے ۱۹۳۳ء میں ان کے ذہن میں آیا۔ انھوں نے دیکھا کہ انگریزی زبان میں اہل سنت وجمہور امت کی طرف سے قرآن مجید کا ایک بھی انگریزی ترجمہ نہیں ہے[۱]۔ بعض احباب کی جانب سے بھی اس کی ضرورت کا احساس دلایا گیا۔ چنانچہ انھوں نے یہ ذمہ داری قبول کی، انگریزی ترجمہ مع حواشی، جولائی ۱۹۳۹ء میں حوالہ طباعت ہوا اور مختلف مشکلات و مراحل سے گزرنے کے بعد ۱۹۴۱ء تک مکمل شائع ہوا۔ انگریزی ترجمہ سے ان کو یہ حوصلہ ملا کہ زیادہ تفصیل و وسعت کے ساتھ اردو ترجمہ و تفسیر کا کام بھی ہو جائے[۲]۔ چنانچہ ۱۹۴۰ء میں انھوں نے اس پر توجہ دی اور تقریباً چار برس میں اسے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا[۳]۔ ۱۹۴۴ء سے اس اردو تفسیر کی طباعت کا آغاز ہوا۔ ایک عرصہ کے بعد تفسیر چھپ کر سامنے آئی تو اس میں کچھ کمیاں اور کوتاہیاں نظر آئیں۔ جن میں کچھ کا تعلق حالات وظروف کی تبدیلی سے ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۴۰ء۔ ۱۹۴۲ء تک بنی اسرائیل دنیا کی ایک مغضوب ترین قوم تھی۔ قدیم تفسیروں کی طرح مولانا نے بھی اپنی اس تفسیر کی آیات متعلقہ میں ان کی اسی حالت کا اظہار کیا تھا۔ ۱۹۴۵ء کے بعد صورت حال بدلنا شروع ہو گئی۔ ۱۹۴۸ء میں یہودیوں کی ایک مستقل حکومت قائم ہو گئی۔ اس کے علاوہ سائنس کی دنیا میں جو حیرت انگیز ترقیاں ہوئیں، ان کی وجہ سے طبعیات اور تکوینیات والی آیتوں میں ان کا لحاظ بھی ضروری ہو گیا، اس لئے مولانا نے نظر ثانی کا کام شروع کیا۔ اس مقالہ میں اسی نامکمل تفسیر جدید کا ایک جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

ترجمہ کی مشکلات

ترجمہ کا کام جس قدر مشکل اور صبر آزما ہے مولانا اس سے بخوبی واقف تھے۔ تفسیر کی پہلی جلد کے افتتاحیہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ غالب و اقبال اور گلستان سعدی و مثنوی مولانا روم کے ترجمے بڑی قابلیتوں اور اہتمام و کاوش سے ہوئے۔ لیکن ان سب میں اصل اور ترجمہ میں ادبی و ذوقی حیثیت سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ تو جب انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کا یہ حال ہے تو دنیا کی ہر عظیم کتاب سے عظیم تر کتاب اور ہر بلند نوشتہ سے بلند تر نوشتہ کے باب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ کسی کے بس کی بات نہیں کہ وہ اس "الکتاب" کو کما حقہ اپنی زبان میں منتقل کر دے[۴]۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے استاذ معنوی مولانا اشرف علی تھانوی کی تفسیر

'بیان القرآن' کے ترجمہ کے بڑے حصہ کو یعنی تقریبا۸۵ فیصدی حصہ سے استفادہ کیا۔ مولانا تھانوی ؒ کی تفسیر کو وہ اردو کی ساری تفسیروں کا سرتاج سمجھتے تھے۔[۵۹]

تفسیر کے مسائل

ان کے سامنے یہ حقیقت بھی تھی کہ ترجمہ سے زیادہ دشوار کام شرح و تفسیر کا ہے۔ قرآن مجید بہ یک وقت زندہ جاوید اور ہمہ وقت تازہ اور عالمی یا آفاقی صحیفۂ ہدایت بھی ہے اور بہ قید زمان و مکان ایک متعین ملک اور متعین ماحول کے لئے مخصوص بھی ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر انھوں نے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ تفسیری خدمات انجام دینے والوں کے لئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ

"قرآن کا خطاب ایک طرف تو دنیا کے ہر ملک و اقلیم کے لئے ہے اور جس طرح وہ پہلی صدی ہجری کے لئے تھا اسی طرح وہ چودھویں صدی ہجری کے لئے بھی ہے۔ ٹھیک اسی طرح یہ حقیقت بھی قابل لحاظ ہے کہ اس کی اولین مخاطب عرب قوم تھی جو تاریخ کے ایک متعین زمانہ یعنی ساتویں صدی عیسوی کے ثلث اول میں موجود و آباد تھی۔ قرآن مجید کی یہ دوگانہ حیثیت یعنی ایک طرف عالمی و آفاقی اور دوسری طرف قومی و وطنی، موجود ہی نہیں بلکہ برابر ساتھ ساتھ چل رہی ہے"[۶۰]

مولانا کے خیال میں اگر یہ حقیقت ملحوظ رہے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ قرآن کی معنویت گو عالمگیر و آفاقی ہے لیکن صورت و قالب کے لحاظ سے وہ بہرحال عربی کلام ہے۔ اس میں زبان کی سلاست و لطافت اور بیان کی فصاحت و بلاغت جو کچھ بھی ملے گی سب عربی ہی کے معیار کے مطابق ملے گی۔ اس لئے زبان کے اس صریح اور واضح معیار کو چھوڑ کر اسے کسی بھی غیر عرب پیمانے سے ناپنے کا مطالبہ کرنا خود اپنے جہل اور نامعقولیت کا مظاہرہ کرنا ہے۔

جدید مفسرین و شارحین کے متعلق مولانا کا خیال تھا کہ ان کے لئے ضروری ہے کہ تاریخ اقوام عالم، علم جغرافیہ، علم مذاہب و ادیان کے ساتھ ساتھ جدید سائنس کے مختلف شعبوں خصوصاً فلکیات سے بھی مطلقاً بے بہرہ نہ ہوں۔ ورنہ باوجود تدین و تقویٰ اور صالحیت و معقولیت کے وہ سخت علمی غلطیوں کا شکار ہو سکتے ہیں۔ ان کا قلم کہیں فرعون اور لشکر فرعون کی غرقابی کو بجائے بحرِ قلزم کے دریائے نیل میں دکھائے گا۔ کہیں حضرت مسیحؑ کا تلوار سے قریب القتل ہونا بیان کرے گا

اور کہیں فرعون کو کسی تاجدار کا شخصی نام سمجھ کر دعوئی الوہیت اس کی شخصیت کی جانب منسوب کرے گا۔

دنیوی علوم وفنون کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کی دریافتیں اور تحقیقات پائدار نہیں ہوتیں بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ نظریات وظنیات بلکہ مقبول ومعروف مسلمات وقطعیات تک تھوڑی مدت کے بعد کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل جس طرح انھوں نے کی ہے وہ اپنی جگہ پڑھنے کے لائق ہے۔ ہم یہاں ان کی اس اہم بحث کا ایک جامع خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

"قرآن مجید نے ساری فرعی، ضمنی اور ثانوی بحثوں سے متعلق کوئی ایسی صراحت نہیں کہ جو عرب کے مذاق کے خلاف ہو۔ اس نے اہلِ عرب کے علمی، عقلی اور فکری مزعومات کو ان کے حال ہی پر چھوڑے رکھا۔ لیکن ایسے اشارے ضرور رکھ دئے اور کلام میں اتنی لچک پیدا کر دی کہ آئندہ نسلیں اپنے اپنے دور کے ماحول فکری کے مطابق اس کتاب الٰہی کی تعبیر وتشریح میں آزاد رہیں۔"

تفسیر کے مراجع ومصادر

مولانا نے جس محنت اور تحقیق سے مستند مراجع ومصادر سے استفادہ کیا ہے اس سے جہاں ان کی دیدہ ریزی اور سعی وکاوش کا اندازہ ہوتا ہے وہیں ان کی یہ احتیاط بھی سامنے آتی ہے کہ وہ کلام اللہ کی ترجمانی میں جمہور اہل سنت کی روش سے کہیں بھی گریزاں نہیں ہیں۔ فن لغت، لغات القرآن، اعراب القرآن، اور علوم القرآن کی امہات کتب مثلاً الجمہرۃ فی اللغۃ، کتاب الاضداد، کتاب الاجناس، لسان العرب، المفردات فی غریب القرآن، مشکلات القرآن، مفردات القرآن، النہایۃ فی غریب الحدیث والتنزیل، اعراب القرآن، مجاز القرآن، الاتقان فی علوم القرآن، البرہان فی علوم القرآن وغیرہ ماخذ سے براہ راست استفادہ کرتے ہیں۔ عربی تفسیروں کا تقریباً سارا سرمایہ ان کے سامنے رہا۔ فقہی تفسیروں میں ابوبکر جصاص رازی حنفی اور قاضی ابوبکر محمد بن العربی مالکی کی احکام القرآن اور ملا جیون امیٹھوی کی تفسیر احمدی ان کے خاص مراجع ہیں۔ ان کے علاوہ وہ اردو کی اہم تفسیروں سے استفادہ کرتے رہے جن میں مولانا تھانویؒ کی بیان القرآن سے سب سے زیادہ متاثر ہیں۔

خصوصیات

ہم یہاں تفسیر ماجدی کا موازنہ دوسری تفسیروں سے نہیں کر رہے ہیں۔ لیکن اپنے مباحث کی جامعیت، ہمہ گیری، مسائل و مرویات میں جمہور مفسرین سے مطابقت اور جدید علوم و معارف سے مولانا کے براہِ راست تعلق اور عصری رجحانات پر گہری نگاہ ہونے کی وجہ سے یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس تفسیر کو امتیازی اور انفرادی حیثیت حاصل ہے۔ اردو کے کامل الفن ادیب و زباں داں ہونے کی وجہ سے مولانا کی تحریر کی دلکش ادبیت بھی اس تفسیر کا ایک نمایاں عنصر ہے۔ فلسفیانہ اطناب سے اجتناب اور حواشی کے اختصار و ایجاز کی وجہ سے بھی تفسیر ماجدی کی شان الگ ہے۔ کتاب اللہ کے مراد و منشا کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے افراط و تفریط کے شکار مسلکوں اور فرقوں اور غلط و باطل افکار و رجحانات کا رد و انکار بھی اس تفسیر کا نمایاں وصف ہے۔ مختلف عصری فلسفوں پر مفسر کی عالمانہ نگاہ کی وجہ سے جس خوبی سے ان کا رد و ابطال اس تفسیر میں ہے۔ دوسری عصری تفسیروں میں اس درجہ توازن و اعتدال اور متانت و اصابت رائے کے ساتھ کم ملتا ہے۔ ہمارے اس دعویٰ کی دلیل کے لئے تو براہِ راست خود تفسیر کا مطالعہ ضروری ہے۔ تاہم یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے کسی حد تک ان کے انداز تفسیر اور منہاج بحث و تحقیق کا اندازہ ہو جائے گا۔

۱۔ مسیحیوں اور مغرب زدہ مسلمانوں کے حوالہ سے عام طور پر سورتوں کی تقسیم سے باب میں یہ کہا جاتا ہے کہ جو سورتیں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ قیام مکہ میں نازل ہوئیں ان کو مکی کہا جاتا ہے۔ اور جو سورتیں ہجرت کے بعد نازل ہوئیں وہ مدنی کہلاتی ہیں۔ مولانا اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ یہ تقسیم صرف عمومی حیثیت سے ہے اور نہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدنی سورۃ کے اندر مکی آیتیں رکھا دی ہیں یا اس کے برعکس، ربط مضمون و مناسبت مقام کا صحیح تر، لطیف تر احساس رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر اور کس کو ہو سکتا تھا۔ اس لئے کسی متعین آیت کے باب میں اس کے مکی یا مدنی ہونے کا فیصلہ جزم کے ساتھ کرنا دشوار ہے۔ روایتیں جو اس باب میں وارد ہوئیں درجۂ تواتر کو پہنچی ہوئی نہیں ہیں۔ محض مفید ظن ہیں، مفید یقین نہیں۔ محض روایات و نظریات کے ماتحت کسی آیت پر جزم و وثوق کے ساتھ کوئی حکم لگا دینا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ قرآن

کی کسی جدید ترتیب پر اسے ترتیب نزولی کا نام دے کر آمادہ ہو جانا بڑی جسارت کا کام ہے۔۔
۔۔۔۔۔ اصل میں یہ بلا مسیحیوں کے یہاں سے آئی ہے کہ انھیں نے اپنے یہاں کے قدیم وجدید دونوں صحیفوں کو جو نہ سند متصل کے ساتھ پہنچے ہیں نہ حسن کے راویوں کا کسی کو علم ہے اور جو نہ اپنی اصلی زبانوں میں موجود ہیں۔ بلکہ محض ترجمے ہیں اس قسم کی سرتاسر ظنی بلکہ وہمی تحقیقات کا تختۂ مشق بنا رکھا ہے اور مغرب زدہ مسلمانوں نے نادانی سے یہ خیال کر لیا کہ جیسے یہ بھی کوئی بڑی دلیل علم وفضل وتحقیق کی ہو۔"[۸]

اس اقتباس سے پوری تفسیر کی ایک جھلک سامنے آجاتی ہے جس میں انھوں نے مسیحیوں کے طرز تحقیق کی ناپختگی ظاہر کرتے ہوئے مغرب زدہ مسلمانوں کی بے جا مرعوبیت کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔

اسی طرح غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ کی تفسیر میں جہاں عربی قواعد، متقدمین مفسرین کے اقوال اور توریت وانجیل کے حوالے دیے ہیں وہیں یہ بھی لکھتے ہیں:

"حیرت ہے کہ بعض جدید اہل قلم نے مسیحی پادریوں کے طعن وطنز سے متاثر بلکہ مرعوب ہو کر اسلام میں غضب الٰہی کے وجود ہی سے انکار کر دینا چاہا ہے۔ گویا حق سبحانہ وتعالیٰ ان کم فہموں کے خیال میں ایک بڑے پیمانہ پر کوئی سادھو، سنیاسی، مہاتما ہیں۔ جو بدبخت چاہے ان کے بنائے اور اتارے ہوئے قوانین کو جو سراسر بندوں ہی کے نفع ومصلحت، فلاح وبہبود کے لئے ہیں۔ آزادی وبے تکلفی سے توڑتا پھوڑتا، چیرتا پھاڑتا رہے اور وہ اہنسا پر عمل کر کے شانتی کے ساتھ، جمود وتعطل کے ساتھ سارا تماشا دیکھتا رہے۔۔۔۔۔ پادریوں کے اعتراض کی اصل وبنیاد ہی غلط ہے۔ انھوں نے غضب الٰہی کو بھی قیاس کیا انسانی غصہ اور طیش پر، جو نتیجہ ہوتا ہے نفس کی ایک انفعالی کیفیت کا، حق تعالیٰ پاک ہے اور ہر قسم کے انفعال اور تاثر سے، وہ صرف فاعل اور تمام تر مؤثر ہے۔ اس کا غیظ وغضب درحقیقت تتمہ اور ضمیمہ ہے اس کی رحمت بے حساب کا اور لازمی نتیجہ ہے اس کی شفقت بے کراں کا۔"[۹]

ازواج مطہرۃ

کی تفسیر میں ان کا یہ اقتباس بھی ان کے اسی مسلک کی ترجمانی کرتا ہے لکھتے ہیں "بعض روشن

خیالوں کو پاکیزہ بیویوں کے نام سے خدا معلوم کیوں اتنی شرم آئی کہ انھوں نے اس معنی ہی سے انکار کر دیا اور ازاج مطہرۃ کی تفسیر عجیب توڑ مروڑ کر کی ہے۔ گویا بہشت میں رضائے الٰہی کے مقام میں ہر قسم کی انتہائی لذت، مسرت و راحت کے موقع پر بیویوں اور پھر پاکیزہ بیویوں کا ملنا بڑے ہی شرم کی بات ہے۔ جنت کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ وہ مادی اور روحانی ہر قسم کی لذتوں مسرتوں اور راحتوں کا گھر ہوگا ——— یا پھر یہ کہ بیوی کے نعمت اور اعلیٰ نعمت ہونے ہی سے انکار ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس عقیدہ کا رشتہ اسلام سے کہیں زیادہ رہبانیت اور مسیح کی لائی ہوئی نہیں پولوس کی پھیلائی ہوئی مسیحیت سے وابستہ ہے۔ جسمانی، مادی، حسی خصوصاً ازدواجی نعمتوں کو حقیر سمجھنا یا ان سے شرمانا تمام تر جاہلی مذہبوں خصوصاً پولوسی مسیحیت سے دماغی مرعوبیت کا نتیجہ ہے۔"[۱۰]

اسلام کے میدان میں جدید اہل قلم کی بے اعتدالیاں اور ناہمواریاں مولانا کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں تھیں۔ "روشن خیالی" کے نام سے اسلامیات کے میدان میں ان حضرات سے دانستہ یا نادانستہ جو بے احتیاطیاں سرزد ہوئیں۔ مولانا ان سے خوب واقف تھے۔ تفسیر میں بیسیوں مقامات ایسے ہیں جہاں مولانا نے ان کے روشن خیالوں کے عقیدہ و فکر کا سخت محاسبہ کیا۔ مثلاً:

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ "یہی سنت آج تک چلی آرہی ہے۔ "ترقی پسندوں" "روشن خیالوں" اور "اہل تجدد" کے دربار سے آج بھی "جمود پسند" "رجعت پسند" "تاریک خیال" وغیرہ کیسے کیسے خطابات خالص و مخلص اہل ایمان کو عطا ہوتے رہتے ہیں۔"[۱۱]

منافقین مدینہ

کے ذکر میں یہ نوٹ دیتے ہیں۔ "دوسرا طبقہ ان منافقین کا تھا جو یکسر مفکر نہ تھے بلکہ آج کے بعض انتہائی روشن خیالوں کی طرح متشککین و مذبذبین میں تھے، اسلام کی ظاہری قوت و شوکت اور مادی اقتدار و فتحمندی کو دیکھ کر چند قدم اس کی طرف بڑھتے اور جب مسلسل کامیابی نہ پاتے تو پھر پیچھے ہٹ جاتے۔"[۱۲]

اَللّٰہُ یَسۡتَہۡزِئُ بِہِمۡ وَ یَمُدُّہُمۡ فِیۡ طُغۡیَانِہِمۡ یَعۡمَہُوۡنَ ۝ کی تفسیر میں عمہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ اس کیفیت کو کہتے ہیں کہ انسان کو راستہ سجھائی نہ دے اور وہ ادھر ادھر اندھوں کی ٹٹولتا اور ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔[۱۳] اس تشریح کے بعد مولانا حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"وحی الٰہی کی روشنی سے محرومی کے بعد بڑے سے بڑے روشن خیال انسان کی بھی واقعی یہی حالت ہوتی ہے اپنی محدود و ناقص عقل کے سہارے وہ چاروں طرف ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ طرح طرح کے "نظریے" "اصول" و "کلیات" بناتا ہے۔ ہر طرف ظن و تخمین کے گھوڑے دوڑاتا ہے کھلا ہوا راستہ جس سے قلب کو سکون کامل ہو جائے کوئی نہیں سجھائی دیتا، شک، ارتیاب، بے اطمینانی کے دلدل میں اور زیادہ پھنستا جاتا ہے۔[۱۴]

حضرت ابراہیم علیہ السلام

کے تذکرہ میں وہ تاریخی اور جغرافیائی تحقیق کے بعد "روشن خیال محققوں" کا ذکر اس طرح کرتے ہیں "موجودہ محرف بائبل میں تاریخی غلطیوں کی کثرت سے اکتفا کر بعض "روشن خیال محققوں" نے انیسویں صدی کے ربع آخر میں کہنا شروع کر دیا تھا کہ ابراہیم نامی کوئی شخصیت گذری ہی نہیں بلکہ یہ تو ایک محض نوعی نام تھا یا ہر شیخ قبیلہ کا لقب، لیکن اب پھر تحقیق کا رخ بدلا اور بیسویں صدی کے ربع اول کے ختم ہوتے ہوتے پھر آپ کی تاریخی شخصیت کا قائل ہونا پڑا۔[۱۵]

نمرود

کے قصہ میں قدیم تفسیروں، توریت اور جیوش انسائیکلوپیڈیا اور انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کے حوالوں کے بعد وہ یہ نوٹ دیتے ہیں "انیسویں صدی کے ثلث آخر میں فرنگی مادیت و عقل پرستی اور اس کی تقلید میں ہندوستانی "روشن خیالی" اور نیچریت کا شدید تقاضا یہ تھا کہ ان قصوں سے سرے سے انکار کر دیا جائے لیکن جوں جوں خود فرنگی مؤرخین کے قدم آگے بڑھتے گئے یہ تشکیک و بے اعتقادی بھی ضعیف تر ہوتی چلی گئی۔"[۱۶]

اِنَّمَا الۡبَیۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا کے تحت انھوں نے پھر مغربی عقل و دانش سے متاثر لوگوں کے متعلق لکھا ہے کہ آج کل کے "روشن خیالوں" کی طرح عہد جاہلیت قدیم کے بھی سفیہوں کا کہنا یہ تھا کہ مالی نفع آخر تجارت میں بھی تو ہوتا ہے، پھر جب تجارت حرام نہیں تو سود کیوں

حرام ہے [۱۷]

تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ کی تشریح میں وہ اپنے خاص انداز میں لکھتے ہیں کہ "کیا تماشا ہے کہ انگریز ہندوستان میں ستی کی رسم کو جرم قرار دیں تو ملک کے محسن ہندوؤں میں بچپن کی شادی کے دستور کو روک دیں تو اس کا شکریہ واجب، لیکن جب اللہ کے سپاہی یہ حق حاصل کرنا چاہیں کہ قانون الٰہی سے بغاوت کرنے والوں اور امن عام کو غارت کرنے والوں کی دار و گیر کریں تو روشن خیالی کے جبین تحمل پر شکن آجائے، اور تہذیب کے پروپیگنڈسٹ اسے رواداری کے خلاف قرار دینے لگیں" [۱۸]

نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا کے حاشیہ میں یہ لکھتے ہیں کہ "یہ مورث کی رائے اور اختیار پر موقوف نہیں حصوں کی ہر قسم اور ترکہ کا ہر استحقاق شریعت الٰہی کا مقرر کیا ہوا قانون ہے، یہ نہیں کہ جو "روشن خیال" جب چاہیں اٹھیں اور جدید حالات کا غور کرکے اس قانون میں قطع و برید کرکے رکھ دیں۔ [۱۹]

وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ کی تفسیر میں تاریخی، روایتی اور تحقیقی بحث کے بعد وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ "یہود وفات عیسیٰؑ کو موقع تحقیر و اہانت میں بیان کرتے ہیں اور مسیحی بعینہٖ اسی واقعہ سے آپ کی عظمت پر دلیل لاتے ہیں۔ لیکن نفس عقیدہ بہرحال دونوں میں مشترک ہے اور تاسف اور قلق کا مقام ہے آج بیسویں صدی عیسوی میں بعض کلمہ گو فرقے بھی اسی "روشن خیالی" کا تمغہ اور تحقیق کا پروانہ سمجھ رہے ہیں۔ [۲۰]

يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ کے تشریحی نوٹ میں وہ اسلامی سزاؤں کے بیان میں لکھتے ہیں کہ "روشن خیالی اور تجدد نوازی جو دوسرا نام ہے جاہلیت فرنگ سے مرعوبیت کا" ممکن ہے اسلامی سزاؤں کی ان سختیوں پر چیں بہ جبیں ہو۔ لیکن ساری قیاسی اور عقلی بحثوں سے قطع نظر صرف عملی اور تجربی حیثیت سے نہ دیکھ لیا جائے کہ جن ملکوں نے اپنے یہاں قانون کو نرم کرکے سزائیں ہلکی سے ہلکی کردی ہیں۔ ان کے یہاں جرائم اور بدامنی کا کیا حال ہے" [۲۱]

تفسیر ماجدی کے مطالعہ میں یہ احساس بار بار ہوتا ہے کہ مولانا اپنے زمانہ کے مذہبی سیاسی معاشی اور فکری و تہذیبی تبدیلیوں اور ان کے اسباب اور ان کے عواقب سے مکمل طور پر باخبر ہیں۔ قوموں کی نفسیات پر ان کی نگاہ بڑی گہری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے اولین مخاطبوں

اور موجوہ مخاطبوں میں وقت کے فاصلوں کے باوجود جو نفسیاتی یا نفسانی قدر مشترک موجود ہے مولانا کی نگاہ ٹھیک اسی نقطہ پر ٹھہرتی ہے، اور اس طرح قرآن مجید کی ترجمانی میں وہ افراط یا تفریط اور غلو و بے اعتدالی سے دور ہیں، مولانا کے عہد میں اسلام اور قرآن پر سب سے زیادہ سخت حملے یورپ کے علم جدید کی جانب سے ہوئے۔ دانش فرنگ کے اثرات غیر یورپی اقوام میں روشن خیالی اور تجدد نوازی کی صورت میں عام ہوئے۔ مولانا نے ان پر حد لگائے ہوئے راہ راست مغربی ذہنیت اور مستشرقین کی دسیسہ کاریوں پر ضرب لگائی۔

وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُم
کی تفسیر میں وہ لکھتے ہیں:

"یعنی وہ اسرار و تعلیمات جو تمہاری مقدس کتابوں اور آسمانی صحیفوں میں محفوظ ہیں۔ یہود جب آپس میں ملتے تو ایک دوسرے کو قائل کرتے کہ تم اپنے یہاں کی پیشین گوئیاں اور خاص تعلیمات مسلمانوں پر کیوں ظاہر کر کے خواہ مخواہ ان کے ہاتھ میں ہتھیار اپنے خلاف دیتے ہو گویا یہ سمجھ رہے تھے کہ رسول اسلام اور پیروانِ اسلام کو جو کچھ بھی علم ہوگا محض ان کے بتانے ہی سے ہوگا۔ یہ جہل مرکب بالکل اسی طرح کا تھا جس میں آج سارا فرنگستان مبتلا ہے۔ یہ لوگ جب قرآن مجید پر تبصرہ کرنے بیٹھے ہیں تو اس مفروضہ کو بنیاد کار بنا لیتے ہیں کہ اس میں جو کچھ بھی مذکور ہے وہ یہود کی توریت مروجہ، مسیحیوں کی انجیل مروجہ اور اسی طرح کے دوسرے انسانی ہی ذرائع سے ماخوذ و منقول ہے"[۲۲]

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ کی آیت میں مرد و عورت کی اخلاقی تکمیل کا جو مؤثر ترین نسخہ اسلام نے پیش کیا اس کے متعلق چند سطروں میں لکھتے کہ "یہ اس مذہب کی تعلیم ہے جو فرنگی محققین کی نظر میں پست اس لئے ہے کہ اس میں عورت کی تحقیر کی گئی ہے۔

ع کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہوگیا!

کونسا جھوٹ اس سے بڑھ کر سخت، اور کون سا اتہام اس سے بڑھ کر صریح ہوگا؟ منوسمرتی والے ہندو مذہب کا ذکر نہیں، عہدِ عتیق و جدید والے یہودی و نصرانی مذہبوں سے سوال

ہے کہ ان کے سارے دفتر کتب واسفار میں کون سی تعلیم زن وشو کے باہمی تعلق محبت و اعتماد کے باب میں اس درجہ کی ہے"؟[۲۳]

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ کے تفسیر میں حاشیہ میں یہود کی منافقت کے متعلق لکھتے ہیں کہ آج یہ بڑے بڑے فرنگی تحقیق یہود و مسیحی مستشرقین نے فرنگی زبانوں میں سیرت نبوی لکھنے کا یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اپنے علم و تحقیق، وسعت مشرب اور بے تعصبی کی دھاک بٹھا کر تمہید بڑے زور کی اٹھاتے ہیں اور معلوم یہی ہونے لگتا ہے کہ پیغمبر عرب اور مصلح عالم کی نعت اور مقنن اعظم اور مثیل موسیٰ کی منقبت میں دریا کے دریا بہا دیں گے۔ لیکن آگے چل کر یہ نکالتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) انھیں کچھ خلل دماغ تھا یا یہود و نصاریٰ کی کتابوں کے مضامین کہیں سے سن سنا کر انھیں چرا لیتے تھے۔ وقس علیٰ ھذا تو یہ بھی ٹھیک قدیم یہود یا نہ دجل و تلبیس کا ایک جدید فرنگی نمونہ ہے اور بس"[۲۴]

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ کی تفسیر میں وہ لکھتے ہیں کہ "ایک امی کی زبان سے بلند پایہ علوم و معارف و حقائق کو صحیح و شستہ پیرایہ بیان میں سن کر ظالموں نے یہ کہنا شروع کیا کہ یقیناً یہ مضامین عالی انھوں نے کسی نصرانی یا یہودی سے خوب پڑھ کر یاد کر لیے ہیں۔ اور جاہلیت کے انھیں لال بجھکڑوں کی نقل آج بڑے بڑے مستشرقین اور فضلائے یورپ کر کے قرآن کی اس پیش خبری کی توثیق کر رہے ہیں"[۲۵]

قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ کے تشریحی نوٹ میں وہ پھر لکھتے ہیں کہ "مشرکین عرب اپنے سے قدیم تر جاہلی قوموں کی طرح اپنے پیغمبر کے پیام کی اعجازی کیفیت و تاثر کو بس سحر ہی پر محمول کر سکتے اور یہی کرتے ——— اور جاہلیت جدید کے علمبردار بڑے بڑے دانایان فرنگ بھی اس کے سوا کیا کر رہے ہیں۔ حیرت انگیز محیر العقول مادی کامیابیوں اور فتحمندیوں سے تو انکار کر ہی نہیں سکتے، بس یہ تعبیر کرنے لگے کہ نعوذ باللہ ساری اسکیمیں اور کارگزاریاں کسی بڑے "زیرک دماغ" کا نتیجہ تھیں"[۲۶]

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ کی تشریح میں وہ لکھتے ہیں کہ "شامت زدہ انسان کی ضلالت کا یہ چوتھا اور بالکل آخری مرتبہ ہے اور افسوس ہے کہ ذکر و فکر آخرت کی طرف سے

یہی بے اعتنائی اور دنیوی ساز و سامان اور مادی علوم و فنون و صنائع کی طرف یہی انہماک اور شدت التفات تہذیب فرنگی و ثقافت جاہلی کا جزو اعظم ہیں۔ مہذب اور اعلیٰ سوسائٹی میں دوزخ و جنت برزخ اور سکرات موت کا کسی زبان پر نام تک نہ آئے، اور علوم جدیدہ کے بڑے بڑے ماہروں اور فاضلوں کو خوب غور سے دیکھ لیجئے کیا ان میں ایک ذرہ برابر بھی طالب معرفت حق کی اور ظواہر مادی سے گزر کر حقائق معنوں تک پہنچنے کی پائی جاتی ہے[۲۷] اسی طرح "اِئْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَا" کے حاشیہ میں وہ پھر جاہلیت فرنگ کی نشاندہی کرتے ہیں کہ "دوسرے قرآن کی فرمائش کے مخاطب ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ تھے۔ آپ ہی کو جاہلیت عرب کے بڑے بڑے روشن خیال، جاہلیت فرنگ کے روشن خیالوں کی طرح قرآن کا مصنف خیال کرتے تھے۔[۲۸]

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ کی تفسیر میں مولانا نے پھر مستشرقین کی ذہنیت پر ضرب لگائی۔ لکھا ہے کہ "کفار بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی بات سنیں گے اور سوچ سمجھ کر مان بھی لیں گے۔ آج یہ تصور بہت سے مستشرقین یورپ پر، سیرت نبوی، شریعت اسلامی اور کلام الٰہی پر قلم اٹھانے والوں پر صادق آتی ہے۔ ان کی کتاب کی تمہیدوں، مقدموں، دیباچوں کو پڑھیئے تو اپنے کو ظاہر کریں گے کہ یہ کیسے بے تعصب، انصاف پسند تحقیق دوست ہیں اور جوں جوں آگے بڑھتے جایئے زہر ہلاہل کے انبار در انبار انہی اوراق میں ملتے جائیں گے، مفروضات و احتمالات کے ڈھیر لگاتے جائیں گے اور قرآن کا کلام الٰہی ہونا اور محمد عربیؐ کا رسول برحق ہونا بطور احتمال بھی اپنے سامنے نہ لائیں گے۔[۲۹]

روشن خیالوں، مستشرقوں اور جاہلیت جدید پر اس قسم کے بلیغ تبصرے تفسیر ماجدی کی بڑی خصوصیت میں سے ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا قدیم و جدید فلسفوں، مثلاً نظریۂ ارتقاء، فلسفہ مادیت، عقلیت، لاادریت، لامذہبیت اور فلسفہ اشتمالیت کی تردید بھی برابر کرتے جاتے ہیں۔ بعض موقعوں پر آریہ سماجی لٹریچر، سوراج اور قومیت کا بھی خاص پیرایہ میں رد کرتے ہیں۔

مسلمانوں میں معتزلہ، اہل بدعت و خوارج کی غلطیوں کی بھی جگہ جگہ نشاندہی کی ہے۔ مزار پرستی، پیر پرستی، غیر اسلامی رسوم و رواج اور متصوفین پر بھی ان کے قلم سے سخت تنقیدیں

نکلی ہیں، مثلاً:

لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں "اس آیت میں رسول اللہ کے علم غیب کلی کی صریح نفی موجود ہے۔ جس کا دعویٰ ہمارے زمانہ کے بعض عالم نما جاہلوں نے کیا ہے۔ یہ اور اس قسم کی متعدد آیات قرآنی اس شخص کے خیال کی تردید میں ہیں جو صفائے قلب و اشراقیت وغیرہ کی بنا پر کشف صدور و اطلاع غیوب کا دعویٰ کرنے لگتا ہے۔

علامہ ابن حیان غرناطی لکھتے ہیں کہ بہت سے مدعیان تصوف کی زبان ایسے دعووں پر کھل گئی ہے کہ یہ لوگ نہ کتاب اللہ پر توجہ کرتے ہیں اور نہ سنت رسولؐ کی طرف، اور غیب دانی کے خرافات پر اتنے دلیر ہیں"۔ اس کے بعد مولانا لکھتے ہیں کہ یہ حال جب آٹھویں صدی کا تھا تو چودھویں صدی کا رہنے والا غریب اپنے وقت کا حال بیان کرنے کے لئے الفاظ کہاں سے لائے"۔[۵۳۰]

مسلمانوں میں بعض فرقوں نے دین و حکومت کی جس تعبیر پر زور دیا، مولانا اس سے متفق نہیں تھے۔ چنانچہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ کے حاشیہ میں اشارتاً انھوں نے اس تعبیر کی تردید کی ہے، لکھتے ہیں "آیت کے اس جزو کو فرقہ خوارج نے بار بار پیش کیا ہے اور اس سے اپنا بڑا کام نکالنا چاہا ہے۔ یہاں تک کہ خلیفہ راشد و برحق حضرت علیؓ کے خلاف بغاوت اسی آیت کو پیش کر کے پھیلائی تھی اور آج بھی ایک گروہ ہر انسانی مادی حکومت کو اسی آیت کے ماتحت غیر اسلامی حکومت قرار دے کر اس سے کسی قسم کا تعاون بھی ناجائز بلکہ حرام ٹھہراتا ہے

سیاق قرآن پر ادنیٰ غور و تامل سے بھی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ آیت کو اس بحث سے ذرا بھی تعلق نہیں، سیاق تمام تر حکومت تکوینی و ارسال آیات و معجزات کا ہے"۔[۵۳۱]

ہماری اب تک کی اس گفتگو سے یہ تاثر پیدا ہو چلا ہے کہ تفسیر ماجدی کلام الٰہی کی جدید کلامی تفسیر ہے، جس میں قرآن اور اسلام کی جانب سے دماغ پر زیادہ زور دیا گیا ہے لیکن تفسیر ماجدی کی جامعیت اور ہمہ گیری کے لئے صرف اتنا ہی کہنا کافی نہیں۔ مفسرین کے اقوال و آراء کی تلاش و انتخاب میں پوری پوری علمی جماعتوں کی محنت و ذوق کا امتحان ہوتا ہے۔ تفسیر ماجدی میں ان کا پورا سرمایہ موجود ہے۔ مختلف فیہ مسائل میں فقہاء کے اقوال کو[۵۳۲] جس جزم و احتیاط کے ساتھ جمع کر کے قول فیصل کی حقانیت کو واضح کیا ہے، عارفانہ اور صوفیانہ اقوال و نکات کو

جس خوبی اور موقع کی مناسبت سے حواشی میں نقل کیا ہے اس سے ان کی بصیرت و معرفت کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ تنوع کا یہ عالم ہے کہ مثنوی مولانا روم، خسرو، اقبال اور اکبر الہ آبادی کے اشعار بھی جا بجا اس گلستان کی بہار میں اضافہ کرتے ہیں اور ان سب پر مستزاد مولانا کا خاص ادبی اسلوب ہے۔ وہ زبان کی نزاکتوں اور باریکیوں پر عبور کی وجہ سے ان کے ترجمہ و تفسیر کی ادبی دل کشی دامن نگاہ کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:۔

فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا کا ترجمہ کیا ہے "اس نے یقیناً ایک بڑا گناہ سمیٹا" حاشیہ میں وہ لکھتے ہیں کہ 'گناہ سمیٹنا' کا محاورہ خاص اس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے ہے۔[۳۳]

وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے "اور یقیناً یہ بالکل جھوٹے لپاڑیے ہیں" حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ "لکاذبون میں ل تاکید کا ہے ترجمہ میں اسی اشدیت کے اظہار کے لئے لپاڑیے بھی بڑھا دیا گیا ہے"۔[۳۴]

لَعِبٌ وَّلَهْوٌ کی تشریح میں وہ یہ نکتہ آفرینی کرتے ہیں کہ "اردو میں لہو و لعب ساتھ آتے ہیں لیکن عربی میں دونوں کے مفہوم میں فرق ہے۔ لعب میں پہلو کسی عمل کی لاحاصلی، بے مقصدی کا زائد ہے جیسے بچوں کے اکثر عمل ہوتے ہیں۔ یہ شعوری طور پر حصول منفعت یا رفع مضرت سے خالی رہتے ہیں اور لہو وہ عمل ہے جو انسان کے سنجیدہ مقصدوں کے منافی ہو اور مقصود اس سے محض عیش و طرب ہو"۔[۳۵]

زبان کے لطف کے لئے انھوں نے ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمہ کی بعض عبارتیں بھی نقل کر دی ہیں۔ مثلاً "فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ" کا ترجمہ "ان کی سرکشی میں بھٹکتے ہوئے چھوڑے رکھتے ہیں" کرنے کے بعد وہ حاشیہ میں لکھتے ہیں: نذیر احمد کی زبان میں "ٹامک ٹوئیے مارتے ہوئے"۔[۳۶]

رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ کا ترجمہ کرتے ہیں "اے ہمارے پروردگار ان کے مال پر جھاڑو پھیر دے"۔ تشریح میں لکھتے ہیں کہ ان کے مال پر جھاڑو پھیر دے، ٹھیٹھ اردو میں نذیر احمدی ترجمہ ہے۔[۳۷]

هٰذِهِ الْقَرْيَةَ کے حاشیہ میں وہ شہر اریحا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کے لفظی معنی سٹی آف دی مون کے بیان کئے گئے ہیں جس کا اردو میں ترجمہ "چند نگر" ہوگا۔[۳۸]

تفسیر ماجدی کی خصوصیات میں سب سے نمایاں مقام یہودی و مسیحی مآخذ کا گہرا تنقیدی مطالعہ ہے۔ عہد نامہ عتیق و جدید کے علاوہ یورپ کے ممتاز اہل قلم کا مولانا نے استیعاب سے مطالعہ کیا ہے اور خود ان کے اقوال کے ذریعہ قرآن مجید کی حقانیت کو ظاہر کیا ہے۔

بنی اسرائیل[۴۰] اور امت موسوی[۴۱]، یہود یا بنی اسرائیل[۴۲]، کفر سلیمان[۴۳]، حضرت ابراہیمؑ[۴۴]، ابن مریم[۴۵]، نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ[۴۶]، انجیل[۴۷]، مسیحی و نصرانی کا فرق[۴۸]، آزر[۴۹]، کشتی نوحؑ[۵۰]، قوم شعیبؑ[۵۱] غرقابی فرعون[۵۲] وغیرہ ایسی بحثیں ہیں جو تاریخی اور جغرافیائی تحقیق کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کے تحقیقی ذوق کی ایک جھلک افتتاحیہ میں ان کی اس عبارت سے ظاہر ہے۔ افتتاحیہ جلد دوم میں وہ لکھتے ہیں کہ "قرآن مجید میں حشو مطلق نہیں، جو عبارتیں سرسری اور پہلی نگاہ میں غیر ضروری بلکہ بے تعلق سی نظر آتی ہیں ان کی بھی جب اہمیت کھل کر رہتی ہے تو ان کی معنویت کا بالآخر اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً سورۃ القصص میں فرعون، ہامان کو حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ کے لئے حکم دیتا ہے

فَاَوْقِدْ لِیْ یٰهَامٰنُ عَلَى الطِّیْنِ فَاجْعَلْ لِّیْ صَرْحًا (القصص:۳۸)	اے ہامان تو میرے لئے مٹی کی اینٹوں کو آگ دے تاکہ پکا محل کھڑا کریں۔

اب اس آیت میں من طین (مٹی کی اینٹوں) حشو ہی معلوم ہوتا ہے لیکن اس حقیقت کو مستحضر کر لیجئے کہ دنیا کی بڑی اور مہذب سلطنتوں میں شاہی محل پتھر ہی کے بنے ہوئے ہیں اور قدرۃً قصر فرعون بھی سنگی سمجھا جاتا۔ سنگ مرمر کا، سنگ رخام کا، یا کسی اور ایسے ہی قیمتی پتھر کا۔ لیکن مصر کی شاہی عمارتوں کی تعمیر پتھر سے نہیں مٹی سے ہوئی ہے اور فن تعمیرات کی تاریخیں جو لکھی گئی ہیں ان میں یہ صراحت سے درج ہے کہ مصر کا تعمیری تمدن سنگی نہیں گلی رہا ہے، قرآن مجید نے اس فنی باریکی کو پیش نظر رکھ کر اور رفع اشتباہ کے خیال سے من طین کی صراحت کر دی اور اس پر حشو کا اطلاق ذرا بھی نہ ہونے دیا۔[۵۳] ایک اور مثال وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ ہے۔ مولانا نے اس آیت کے ضمن میں کئی نکتے پیش کیے ہیں:

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ ۝	اور سلیمان نے تو کبھی کفر نہیں کیا۔

(جیسا کہ ناسپاسوں، کافروں اور افترا پردازوں نے مشہور کر رکھا ہے)

آیت کے اس مقام پر پہنچ کر مومن کے قلب میں ذرا کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ یہ کہنے والی

کون سی بات تھی جو قرآن نے فرمادی۔ جب حضرت سلیمانؑ پیغمبر برحق تھے تو یہ کھلی ہوئی اور موٹی سی بات ہے کہ آپ شائبہ کفر و شبہ کفر سے بمراحل دور تھے۔ پیغمبر کے حق میں یہ نازل ہونا کہ کفر سے بری تھے یہ تو کچھ ایسی ہی بات ہوئی ہے کسی ملک کا بادشاہ یہ فرمان جاری کرکے رعایا کو بتلائے کہ ہمارا نائب السلطنت باغی و غدار نہیں۔ کھٹک بجا ہے۔ قرآن مجید کبھی کوئی چھوٹا سا بیان بھی بے ضرورت نہیں دیتا۔ یہاں اس اعلان و اعلام کی ضرورت تھی، اس ضرورت کا علم سادہ دل مسلمانوں کو کیسے ہوسکتا ہے؟ اس کا علم تو اس کے ہمہ بیں و ہمہ داں پروردگار ہی کو ہوسکتا تھا۔ حضرت سلیمانؑ کو پیغمبر ماننے والی دو قومیں مسلمانوں سے پہلے بھی ہوچکی ہیں، یعنی یہود و نصاریٰ، ان دونوں کے اکابر نے ستم ظریفی کا کمال یہ دکھایا ہے کہ ایک طرف تو ان کی عظمت و پیغمبری کے قائل ہیں اور دوسری طرف ان کے نامۂ اعمال میں گندے سے گندے جرائم بھی ڈال دیے ہیں۔ یہاں تک کفر و شرک بھی، کہ اللہ کی عدالت میں کوئی جرم اس سے بڑھ کر یا اس کے برابر بھی سنگین تصور میں نہیں آسکتا۔ یہودی قصص و حکایات اور مسیحی آثار و روایات کی کتابوں کو چھوڑیے۔ خاص الخاص بائبل یعنی عہدِ عتیق کے صحائف جن پر یہود و نصاریٰ دونوں کا ایمان ہے انھیں ملاحظہ فرمالیجیے کہ اس مجموعہ میں آج تک کیا تصریحات لکھی چلی آرہی ہیں۔

۱۔ جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جورؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا اور اس کا دل اپنے خدا کی طرف مائل نہ تھا۔ (سلاطین۔ ۱۱: ۴، ۶، ۱۰)

یعنی محض غفلت یا عدم اعتنا کی بنا پر عملی کوتاہی یا عصیان نہیں، صریح بدعقیدگی، توحید کی طرف سے بے یقینی، آگے اور ملاحظہ ہو:

سو از بس کہ اس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے برگشتہ ہوا اس لئے خداوند سلیمان پر غضبناک ہوا کہ اس کے حکم دیا تھا کہ اجنبی معبودوں کی پیروی نہ کرے۔ پر اس نے خداوند کے حکم کو یاد نہ کیا۔" (سلاطین۔ ۱۱: ۹، ۱۰)

معاذ اللہ! خدا کا پیغمبر اور کفر و شرک میں مبتلا، دنیا سیکڑوں سال تک ہزار ڈیڑھ ہزار سال تک انھیں یہود یا نہ تحریفات و اختراعات کا شکار ہوکر اس مواعداعظم کو نعوذ باللہ کافر و مشرک سمجھتی رہی۔ یہاں تک کہ قرآن آیا جو ہر قوم، ہر زمانہ کے سچے پیغمبروں کی عزت و ناموس کا

محافظہ ہے۔ اب قدرتِ حق کا اعجاز دیکھئے کہ اب جو محققانہ فاضلانہ کتب بائبل کے پرستاروں کی قلم سے نکل رہی ہیں اور شائع ہو رہی ہیں۔ وہ تائید و تصدیق بائبل کی الزام دہی کی نہیں، قرآن کے جواب صفائی کی کر رہی ہیں۔ انسائیکلو برٹانیکا کے سب سے آخری اڈیشن میں جو مقام نکلا ہے اس میں صاف یہ مضمون ملے گا: "سلیمان خدائے واحد کے مخلص پرستار تھے" (جلد دوم طبع چہارم) انسائیکلو پیڈیا ببلیکا نے تو اب صاف لکھدیا ہے کہ یہ عبارتیں بعد کو بڑھائی گئی ہیں۔ اور الحاقی ہیں۔ اور پھر لکھا ہے:

"یہ تو غالباً صحیح ہے کہ سلیمان کی بیویاں متعدد تھیں۔ اسرائیلی بھی اور غیر اسرائیلی بھی۔ لیکن نہ تو انھوں نے سب کے لئے قربان گاہیں تیار کرائیں اور نہ خود خدائے واحد کی پرستش کے ساتھ اپنی بیویوں کے دیوتاؤں کی پرستش کا تجربہ ہونے دیا"[۵۲]

اسی طرح آیت لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ الخ کی لغوی اور تفسیری تحقیق کے بعد لکھتے ہیں: "ظہورِ اسلام سے قبل دنیا کی بے شمار گمراہیوں میں سے ایک گمراہی سمت پرستی کی تھی۔ یعنی بے جان دیوتاؤں، دیویوں، مورتیوں، پتھروں، درختوں، پہاڑوں، دریاؤں کے علاوہ خود سمتوں یا جہتوں کی بھی پرستش جاری اور مختلف جاہلی قوموں نے یہ اعتقاد جما لیا تھا کہ خلاف مخصوص سمت مثلاً مشرق مقدس ہے اور فلاں متعین جہت مثلاً مغرب قابلِ پرستش ہے، قرآن مجید یہاں شرک کی اسی صورت خاص کی تردید کر رہا ہے اور ارشاد کر رہا ہے کہ کسی جہت میں کیا تقدس رکھا ہے اور کوئی سمت بہ حیثیت سمت ہرگز قابلِ تقدس نہیں، طاعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے حضرات مفسرین کو اس آیت میں جو اشکال نظر آیا وہ محض اس لئے کہ ان کی نگاہ مذاہب غیر کی اس گمراہی پر نہ تھی، اسلام نے ظاہر ہے کہ نماز کے لئے کوئی سمت بہ حیثیت سمت ہرگز متعین نہیں کی ہے۔ اس نے نہ صرف ایک متعین مکان یعنی خانہ کعبہ کو ایک مرکزی حیثیت دی ہے اور اسے قبلہ توجہ ٹھہرایا ہے خواہ وہ کسی سمت میں پڑ جائے۔ بہت سے مقامات سے ان مختلف سمتوں کے مختلف گوشوں میں یہ حیثیت سامنے رہے تو اشکال از خود رفع ہو جاتا ہے اور مختلف تاویلوں کی ضرورت نہیں رہتی"[۵۳] اس کے بعد مشرق و مغرب کے حاشیے مولانا کی تحقیق کے نادر خوبصورت نمونے ہیں، مشرق و مغرب کی تشریح میں اور بالوں

کے ساتھ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

"پولوسوی مسیحیوں نے جہاں اور بہت سے مشرکانہ مراسم رومیوں سے اخذ کئے وہیں اس مشرق پرستی کو بھی ان سے لے لیا، اور عبادت مشرق کی طرف رخ کر کے کرنے لگے۔ چنانچہ مسیحیوں کے گرجے آج تک مشرق رُو بہ چلے آتے ہیں"۔

"آفتاب کے طلوع و غروب پر قیاس کر کے مشرک ذہنیت نے یہ نتیجہ نکالا کہ جس طرح مصدر حیات سمت مشرق ہے اسی طرح مستقر موت و اجل سمت مغرب ہے اور اسی لئے یہ بھی مستحق تعظیم و تقدیس ہے"[۵۴]

متشابہات

کی لغوی تشریح اور تفسیر کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "اس پر کہنا چاہیئے کہ سب کا اجماع ہے کہ قرآن مجید میں متشابہات صرف وہی آیات ہیں جن میں اخبار غیب بمعنی صفات آخرت وغیرہ کا بیان ہے"[۵۵]

اس کے بعد وہ اِبْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "جن کے دلوں میں حق طلبی، حق جوئی و تلاش صداقت نہیں ہوتی وہ اسی ادھیڑ بن میں لگے رہتے ہیں کہ دین میں کوئی نہ کوئی فتنہ برپا کریں اور بجائے اس کے کہ خود دین کی راہ پر چلیں دین کو اپنی راہ پر چلانا چاہتے ہیں اور یہ لوگ نصوص کلام الٰہی کو توڑنے مروڑنے میں کوئی باک نہیں رکھتے، جیسا کہ آج کل بھی ہر فرقہ باطل کی تاویلات میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے"[۵۶]

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا اس سے واضح ہے کہ فن تفسیر کے معیار پر تفسیر ماجدی فنی اعتبار سے کامل و بلند پایہ ہے۔ یہاں اس تفسیر کی ایک اور خصوصیت بلکہ اس تفسیر کی اصل روح کی طرف اشارہ ضروری ہے۔ اور وہ ہے کلام الٰہی کے مراد و منشا کی حقیقی اور پرزور ترجمانی، کیونکہ وہ اس حقیقت سے باخبر تھے اور معترف بھی تھے کہ قرآن، اصطلاحی مفہوم میں کوئی علمی یا ادبی یا تحقیقی مقالہ نہیں، اصلاً وہ محض کتاب ہدایت ہے یا انسانی زندگی کا انفرادی یا اجتماعی دستور العمل، اس کی دنیا سرتاسر حکمت و اخلاق، روحانیت، عبدیت و انابت کی دنیا ہے اس کی فضا سکینت قلب کی فضا اور اس کا ماحول تقویٰ و طہارت کا ماحول ہے۔ اس کے

مغز تک پہنچنے کے لئے تقویٰ وطہارت کسی درجہ میں بہرحال ناگزیر ہے، طہارت جسم کی طرح طہارت قلب کا ذرا سا بھی اہتمام کئے بغیر محض زبان ولغت کے بل پر قرآن فہمی کی سعی یکسر لاحاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تفسیر ماجدی کے ہر ہر صفحہ پر منشائے الٰہی کی تعبیر مولانا کے ایمان، عقیدہ، جذبہ اور خلوص کے سبب نہایت طاقتور اسلوب میں ادا ہوتی جاتی ہے۔

حواشی

۱؎ عبدالماجد دریابادی، آپ بیتی، مکتبہ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ، ۱۹۷۴ء، ص ۲۹۲۔

۲؎ نفس مصدر، ص ۲۹۶۔ ۳؎ نفس مصدر، ص ۲۹۷۔

۴؎ تفسیر ماجدی، صدق حدید بک ایجنسی، لکھنؤ، طبع ثانی، ۱۹۶۸ء، جلد اول، افتتاحیہ، ص ۱۔

۵؎ نفس مصدر، جلد اول، افتتاحیہ، ص ۴۔ ۶؎ نفس مصدر، افتتاحیہ، ص ۴، ۵۔

۷؎ نفس مصدر، افتتاحیہ، ص ۵۔ ۸؎ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص ۲۔

۹؎ نفس مصدر، ص ۱۳۔ ۱۰؎ نفس مصدر، ص ۵۴، ۵۵۔

۱۱؎ نفس مصدر، ص ۳۶۔ ۱۲؎ نفس مصدر، ص ۴۱۔

۱۳؎ نفس مصدر، ص ۳۸۔ ۱۴؎ نفس مصدر، ص ۳۹۔

۱۵؎ نفس مصدر، ص ۲۱۵۔ ۱۶؎ نفس مصدر، ص ۴۳۴۔

۱۷؎ نفس مصدر، ص ۵۱۲۔ ۱۸؎ نفس مصدر، ص ۶۲۸۔

۱۹؎ تفسیر ماجدی، صدق جدید، لکھنؤ، جلد دوم، ص ۱۵۔

۲۰؎ نفس مصدر، ص ۱۵۸۔ ۲۱؎ نفس مصدر، ص ۲۴۰۔

۲۲؎ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص ۱۴۲۔ ۲۳؎ نفس مصدر، ص ۳۳۵۔

۲۴؎ نفس مصدر، ص ۶۰۵۔ ۲۵؎ تفسیر ماجدی، جلد دوم، ۴۳۳۔

۲۶؎ تفسیر ماجدی، جلد سوم، ص ۸۲ ۲۷؎ نفس مصدر، ص ۴۸۔

۲۸؎ نفس مصدر، ص ۵۱۔ ۲۹؎ نفس مصدر، ص ۷۲۔

۳۰؎ نفس مصدر، ص ۱۰۔ ۳۱؎ تفسیر ماجدی، جلد دوم، ص ۳۸۹۔

۳۲؎ مثال کے طور پر ملاحظہ کیجئے: تفسیر ماجدی، جلد اول، ص ۳۱۷، ۳۷۹، ۴۰۴، جلد دوم، ۲، ۳، ۷۲۔

۳۳ تفسیر ماجدی، جلد دوم، ص ۶۶۔
۳۴ نفس مصدر، ص ۳۶۷۔
۳۵ نفس مصدر، ص ۳۷۰۔
۳۶ تفسیر ماجدی، جلد سوم، ص ۵۰
۳۷ نفس مصدر، ص ۹۸۔
۳۸ تفسیر ماجدی، جلد دوم، ص ۶۰۷۔
۳۹ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص ۹۴۔
۴۰ نفس مصدر، ص ۱۱۹، ۱۲۳۔
۴۱ نفس مصدر، ص ۱۷۵۔
۴۲ نفس مصدر، ص ۲۱۵۔
۴۳ نفس مصدر، ص ۴۷۔
۴۴ تفسیر ماجدی، جلد دوم، ص ۲۱۶، ۲۱۷۔
۴۵ نفس مصدر ۲۶۳۔
۴۶ نفس مصدر، ص ۳۰۰۔
۴۷ نفس مصدر، ص ۴۰۴۔
۴۸ نفس مصدر، ص ۵۴۱۔
۴۹ نفس مصدر، ص ۵۵۹۔
۵۰ تفسیر ماجدی، جلد سوم، ص ۹۹، ۱۰۰۔
۵۱ تفسیر ماجدی، جلد سوم، اقتتاحیہ، ص ۲۔
۵۲ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص ۱۷۵، ۱۷۷۔
۵۳ نفس مصدر، ص ۳۰۲۔
۵۴ نفس مصدر، ص ۳۰۲، ۳۰۳۔
۵۵ نفس مصدر، ص ۵۳۹۔
۵۶ نفس مصدر، ص ۵۴۰۔

علامہ حمید الدین فراہیؒ ـــــ حیات وافکار

(مقالات فراہی سمینار)

مولانا فراہی سمینار (منعقدہ ۸۔۱۰ ۱۹۹۲ء مدرسۃ الاصلاح سرائے میر) میں پیش کئے گئے مقالات کا گراں قدر مجموعہ۔ جس میں:

- مولانا فراہی کی حیات وعلمی خدمات کے مختلف گوشے زیر بحث آئے ہیں:
- اصول تفسیر، ماخذ تفسیر، نظم قرآن، اقسام قرآن اور قرآنی علوم کے دیگر پہلوؤں پر ان کی تحقیقات ونتائج فکر کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔
- قرآن وحدیث میں تعلق، خلافت الٰہی، بلاغت ومعانی، شعروادب اور قدیم علوم وفنون کی تدوین نو سے متعلق مولانا فراہی کے خیالات کا تنقیدی جائزہ اور ان کی نگارشات کا تعارف ملتا ہے۔

صفحات: ۵۹۲ آفسیٹ کی عمدہ وروشن طباعت قیمت: ۱۵۰/ روپئے

ملنے کے پتے

دائرۂ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ (یو۔پی)

ادارہ علوم القرآن، پوسٹ بکس نمبر ۹۹، سرسید نگر۔ علی گڑھ